”کاغذی گھاٹ“ عورت کتھا

Kagazi Ghaat: Tale of Woman

ڈاکٹر محمد ابوذر اسلم

لیکچرار اُردو، گورنمنٹ گریجویٹ کالج ماڈل ٹاؤن، لاہور

Abstract:

The system of social hierarchy is inescapable. No creation can detach itself from its social circumstances. This is why an author primarily discusses the issues surrounding them in their writings. Nature has endowed women with the ability to control and restrain their emotions. They endure the dominance and harshness of men under the weight of their desires and deprivations, but internally, they suffer from breakdown and collapse. Khaleda Hussain, in *Kaghai Ghaat*, attributes a woman's inner fears, anxieties, restlessness, and loneliness to her internal breakdown and collapse. In reality, the superiority of men over women is an established norm in our social system, and this is the foundation of our societal values. On the surface, a man may not kill a woman, but by controlling her freedom, he reduces her to nothingness. In *"Kaghai Ghaat"*, the oppression of women is the central theme.

Keywords:

Kaghai Ghaat, Feminism, Social circumstances, Deprivations, Exploitation, Oppression, Ideological

خالدہ حسین نے ۱۷۴ صفحات پر مشتمل ایک مختصر ناول "کاغذی گھاٹ" تحریر کیا ہے جو ۲۰۰۲ء میں منظر نامے پر آیا۔ خالدہ حسین نے اس ناول کو گیارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ناول کا انتساب ان کی بڑی بہن محمودہ اصغر کے نام ہے۔ جہاں تک ناول کے نام کا تعلق ہے، یہ خواجہ حسن نظامی کے مجموعہ مضامین "سی پارۂ دل" میں موجود ایک مضمون "من کہ دھوبی کاغذی گھاٹ" سے ماخوذ ہے۔ اس مضمون میں ایک دھوبی اور اس کی بیوی میں ہونے والی بحث سے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ انسانی وجود کی مثال میلی گدڑی کی سی ہے۔ جو گناہوں اور شک وشبہات کے دھبوں سے اٹی ہوئی ہے۔ اس گدڑی کی اجلائی نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنے سے ہی ممکن ہے:

> "دھوبی نے کہا یہ میلی گدڑی ساری دنیا ہے۔ خود ہمارے وجود ہیں اور ان گناہوں اور شک وشبہ کے دھبوں کو دور کرنے کے لیے خدا نے یثرب نگر میں، جو عرب میں ہے اور جس کو مدینہ بھی کہتے ہیں، ایک بڑے چودھری کو پیدا کیا، جس نے سارے جہان کے دھبے دور کر دیے اور سب میلی گدڑیاں دھو کر رکھ دیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ میں بیچارہ غریب دھوبی کاغذی گھاٹ پر کپڑے دھونے آیا ہوں۔"(۱)

ناول میں کاغذی گھاٹ سے مراد کتابی دنیا لیا گیا ہے۔ اس کتابی دنیا کے توسط سے خالدہ حسین نے ایک مخصوص عہد کے حالات وواقعات اور مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ زمانی اعتبار سے یہ ناول تحریکِ پاکستان کے عروج سے لے کر سقوط ڈھاکہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ دراصل یہ وہی عہد ہے جس میں خالدہ حسین نے اپنا بچپن اور جوانی کا عرصہ گزارا۔ مونا کے کردار کا سہارا لے کر ایک طرف خالدہ حسین نے اپنے عہد کے معاشرتی، سیاسی اور سماجی حالات کو ناسٹلجیا کی مدد سے پیش کیا ہے۔ دوسری طرف انھوں نے زندگی کی مشکلات کے سامنے انسانی بے بسی کو واضح کیا ہے۔ اگر یوں کہا جائے

کہ مصنفہ نے انسانی زندگی کی المناکی کو استعارتاً "کاغذی گھاٹ" کہا ہے تو بے جانہ ہو گا۔ انسان امیدوں اور امنگوں کے ساتھ خواہشات کے سمندر میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔ تاہم زندگی کی طلاطم خیز ی اسے اپنے ساتھ بہائے پھرتی ہے اور اسے منزل سے ہم کنار ہونے سے روکتی ہے۔ یوں منزل انسان کے لیے وہ کاغذی گھاٹ ہے جو ہمیشہ اس کی پہنچ سے باہر ہی رہتی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز حسین کے خیال میں خالدہ حسین نے مونا کے ذریعے زندگی کی المناکی کو پیش کیا ہے اور "کاغذی گھاٹ" زندگی کی اسی المناکی کی علامت ہے:

> "مونا نے غم ذات اور غم کائنات دونوں کا اظہار کیا ہے اور اس کا داخل کرب ہر قسم کی صورتِ حال میں نمایاں ہے۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے گویا تاریخ کے سفر میں انسانی ذات کے کرب ناک سفر کو 'کاغذی گھاٹ' کی علامت سے واضح کیا گیا ہے۔"(۲)

مصنفہ نے مشاہدات کی روشنی میں واقعات کو اس کمال مہارت سے پیش کیا ہے کہ قاری ماحول کا حصہ نہیں بنتا بلکہ مرکزی کردار کی سوچ کے دھارے میں بہتا چلا جاتا ہے۔ ناول کی کہانی بنیادی طور پر تین سہیلیوں مونا، عائشہ اور افروز کے گرد گھومتی ہے۔ جو تین مختلف طبقات کی نمائندہ ہیں۔ تینوں سہیلیاں زندگی کے بارے میں الگ نقطہ نظر رکھتی ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار مونا ہے۔ ناول کے تمام کردار بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر مونا سے جڑے ہوئے ہیں۔ "کاغذی گھاٹ" میں مصنفہ نے مخصوص عہد کی عکاسی کی ہے۔ تیس سے پینتیس سال کے اس دورانیے میں پیش آنے والے تاریخی، سیاسی اور معاشرتی سانحات کے بارے میں عام انسان کے نقطہ نظر کو خالدہ حسین نے مونا جیسی حساس اور ذہین لڑکی کے ذریعے پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی اس بحرانی دور میں نوجوان نسل کی بے چینی کو پیش کیا ہے۔ تاہم بنیادی طور پر ناول کا موضوع انسان کے معاشرتی مسائل اور زمانے کی طلاطم خیزی میں اپنی بقا کی جنگ ہے۔

"کاغذی گھاٹ" کی تمام کہانی مرکزی کردار کے گرد ہی گھومتی ہے۔ مرکزی کردار مونا اپنے بچپن میں تحریک پاکستان، تقسیم، فسادات، ہجرت اور مہاجرین کے مسائل کو اپنی تمام تر حساسیت کے ساتھ محسوس کرتی ہے۔ اسکول اور گھر میں سنائی جانے والی لوک کہانیوں اور تاریخی واقعات کا تضاد اس کے معصومانہ ذہن میں کئی سوالات کو جنم دیتا ہے۔ مونا اسکول سے کالج کی زندگی میں قدم رکھتی ہے، جہاں عائشہ اور افروز کی خود اعتمادی اس کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ بچپن سے جوانی کے سفر کے دوران مونا کے ارد گرد کا ماحول، معاشرتی منظر نامہ، پڑوسی، دلچسپیاں، مشاغل، علاقائی، سیاسی اور ملکی صورت حال تیزی سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ بدلتے منظر نامے کے ساتھ مونا کی ذہنی اور فکری صورت حال بھی ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ جو اس کی شخصیت کے تخلیقی پہلو کو اجاگر کرنے کا سبب بنتی ہے۔ وہ معاشرے کی ناہمواریوں، سیاسی عدم استحکام اور صنفی امتیازات کو ایک لکھاری کی نظر سے دیکھتی ہے، زندگی اس کے سامنے نئی معنویت کے ساتھ آشکار ہوتی ہے۔ وہ تمام کردار جو کبھی اس کے لیے قابل رشک تھے ان کا کرب ناک انجام مونا کو افسردہ کر دیتا ہے۔ دیگر کرداروں کی طرح مونا کی کہانی اس کی شادی پر ختم ہو جاتی ہے۔ ذیل میں ہم موضوعاتی اعتبار سے "کاغذی گھاٹ" پر سیر حاصل بحث کریں گے۔

"کاغذی گھاٹ" ایک ایسی پکچر گیلری ہے جس میں عورت زندگی کے مختلف روپ لیے ہوئے اپنی مظلومیت کی ساتھ جلوہ گر ہے۔ ناول کے کینوس پر صنفِ نازک کہیں بیٹی، کہیں بہن، کہیں بیوی اور کہیں ماں کے روپ میں آتی ہے اور

اپنے حصے کا دکھ سمیٹ کر منظر سے غائب ہو جاتی ہے۔ہمارے معاشرے میں عورت جس جبر واستحصال کا شکار ہے،وہ اس سے کماحقہ آگاہ ہوتے ہوئے بھی بے بس ہے۔صدیوں پر محیط اس جابرانہ نظام کو بدلنا،اس کے لیے ناممکن سا ہو گیا ہے۔ خالدہ حسین نے پڑھی لکھی لڑکیوں کی انقلابی سوچ کے ذریعے معاشرے کو کہیں فلسفیانہ انداز اور کہیں معاشرتی کھانچوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے انتظار حسین اپنے ایک کالم میں "کاغذی گھاٹ" کو معاشرے میں عورت کی غم ناک تصویر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "The novel may be read as the sad portrayal of the sad plight of women in our society".(3)

آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب

دنیا کو دینا ہو گا ان ، حق تلفیوں کا جواب(حالی)

عورت پر جبر واستحصال کے خلاف آواز بلند کرنے اور معاشرے میں اسے ایک آزاد، پر اعتماد اور پُر وقار مقام دینے پر اصرار کرنے والوں کو فیمینزم تحریک کا نمایندہ قرار دیا گیا۔خالدہ حسین کے ناول "کاغذی گھاٹ" میں اس تکنیک کو پوری جزئیات سے دیکھا جاسکتا ہے۔"کاغذی گھاٹ" میں فیمینزم کے موضوعاتی مطالعے سے پہلے فیمینزم (Feminism) کو سمجھنا ضروری معلوم ہوتا ہے، تاکہ جب ناول پر اس کا اطلاق کیا جائے تو حقائق زیادہ گہرائی سے ابھر کر سامنے آئیں۔

فیمینزم (Feminism) دنیا کے مختلف ممالک میں ان کے معاشرے،مزاج اور ضروریات کے مطابق شکل اختیار کرتی ہے۔ جس میں خود عورتوں کی تعلیم شعور، کلاس اور ماحول کا دخل ہوتا ہے۔ عورتیں اپنی جدوجہد کے دوران، پدر شاہی کو سمجھنے،اس سے نجات حاصل کرنے اور غیر استحصالی معاشرہ قائم کرنے کے مراحل سے گزرتی ہیں۔ جنوبی ایشیا کے پس منظر میں دیکھیں تو فیمینزم کی تعریف یوں سامنے آتی ہے:

> "Feminism is an awareness of patriarchal control, exploitation and oppression at the material and ideological level of women's Laboure, fertility and sexuality, in the family, at the place of work, in the society in general and conscious action by women and men to transfer the present situation".(4)

مندرج بالا اقتباس کی رو سے کوئی بھی عورت یا مرد جو مخصوص حالات کو بدلنے کی کوشش کرے فیمینسٹ ہو سکتا ہے۔عورتوں کے حقوق یا فیمینزم کی جدوجہد میں ترقی پسند کمیونسٹ تحریک نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔ ہیگل(Hegel) اور لینن (Lenin) نے عورت کی محکومی کے بارے میں ایک جامع تحقیق پیش کی کہ کس طرح نو آبادیاتی سرمایہ دارانہ نظام نے عورت کی آزادی کو غلامی میں بدل دیا ہے۔ لینن کی "Origin of " Family and Safety نے عورتوں میں شعور اجاگر کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

ہمارے معاشرے میں فیمینزم کا عمومی مطلب مغربی تقلید میں پدر سری نظام کے خلاف بغاوت اور مردوں سے نفرت کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ تاہم فیمنسٹ سوچ کے حامل لوگوں کے لیے فیمینزم؛ عورت کے معاشی، معاشرتی اور جنسی تشخص کے تحفظ کا نام ہے۔ فہمیدہ ریاض کے مطابق:

"فیمینزم ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا مطلب لوگ اپنی اپنی طرح سے سمجھتے رہتے ہیں۔ مگر میں نے جب بھی اسے استعمال کیا تو ہر بار میرے ذہن میں اس کا یہی مطلب رہا کہ عورت کے مکمل جسمانی وجود کو تسلیم کیا جائے اور اس کے کسی پہلو کو کچل کر نابود کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔"(۵)

تاریخِ عالم کا جائزہ لیا جائے تو کم و بیش دنیا کے تمام معاشروں میں عورت کو مردوں کی نسبت کم تر سمجھا جاتا ہے۔ انسانی معاشرے کے ابتدائی دور میں مادر سری نظام زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ لہٰذا معاشرے میں عورت کو ایک معتبر رتبہ حاصل تھا۔ اس حوالے سے ہندوستانی تہذیب کا جائزہ لیا جائے تو یہاں بھی دیگر قدیم تہذیبوں کی طرح مادر سری نظام نمایاں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب میں دیوتاؤں سے زیادہ دیویوں کو معتقد اور طاقتور مانا جاتا ہے۔ جیسے جیسے معاشرے نے ارتقائی منازل طے کیں، مادر سری نظام پر پدر سری نظام غالب آنے لگا۔ ہندوستانی معاشرے میں برہمن پنڈتوں کی مذہب پر اجارہ داری سے معاشرہ ذات پات کی نفرتوں کا شکار ہوا۔ جس کا لازمی نتیجہ طبقاتی اور صنفی تقسیم کی صورت میں سامنے آیا۔ یوں ہندوستانی معاشرے میں عورت کے حقوق بتدریج سلب ہوتے گئے یہاں تک کہ ستی کی رسم نے عورت سے مرد کے بغیر جینے کا حق بھی چھین لیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے عورت کا تقدس بہت حد تک بحال ہوا تاہم مذہبی انتہاپسندی، معاشرتی اثرات اور جاگیر دارانہ نظام نے عورت کی مظلومیت کو کم نہیں ہونے دیا۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں عورت کو کچھ قانونی حقوق دے دیے گئے تاہم عملی طور پر ان کا اطلاق آج بھی مکمل طور پر نہیں ہو سکا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی عورت کی معاشرتی حالت زار میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہو سکی۔ پاکستان کے بہت سے علاقوں میں جاگیر داری اور قبائلی نظام جمہوریت پر غالب ہیں۔ جاگیر داری اور قبائلی نظام میں عورت کو کہیں مرد کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے تو کہیں "وانی" اور "سوارا" کی صورت استحصال کی مثال بننا پڑتا ہے۔ پاکستان میں کچھ طبقات میں عورتیں بہت بااثر اور طاقت ور ہیں تاہم مجموعی طور پر عورت کو تعلیم سے محروم رکھنے، خاندانی تنازعات میں بدلے کے طور پر بے توقیر کرنے اور جنسی استحصال کی بے شمار مثالیں آپ کو معاشرے میں ملیں گی۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت اپنے حق کے لیے آواز تو بلند کرنا چاہتی ہے لیکن فیمینسٹ کہلانا پسند نہیں کرتی، کیونکہ ہمارے ہاں فیمینزم کو قابل سزا جرم سمجھا جاتا ہے۔

ادب جو معاشرے کا ترجمان ہے، اس معاشرتی المیے کا اظہار بھی بخوبی کرتا ہے۔ عورت کی معاشرتی مظلومیت کا اظہار دیگر اصناف کی طرح ناول میں بھی ہوا ہے۔ اردو ناول میں عورت زیادہ تر کمزور اور مظلوم طبقے کے طور پر سامنے آئی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے مراۃ العروس، توبتہ النصوح اور بنات النعش جیسے ناولوں سے عورت کے مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے بہتر عائلی زندگی کے لیے عورت کی تربیت کو لازمی سمجھتے ہیں۔ اردو ناول نگاری میں مرزا ہادی رسوا نے معاشرے میں عورت کی آشوب ناکی کو طوائف کی زندگی کے ذریعے پیش کیا ہے۔ والد کی دشمنی کا بدلہ معصوم بچی کو ٹھے پر نیلام ہو کر چکاتی ہے۔ لیکن جب اسی امیرن کی ملاقات امراؤ جان بننے کے بعد اپنے بھائی سے ہوتی ہے تو وہ اپنی بہن کو ہی موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے لاتعلقی کا اظہار کر دیتا ہے۔ علامہ راشد الخیری نے بھی اپنے استاد اور پھوپھا نذیر احمد کی پیروی میں حقوق نسواں اور اصلاحِ نسواں کے لیے قلمی جہاد کا آغاز کیا۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں خواتین کی زندگی کے ہر گوشے کی المناکی کو پیش کیا۔ اسی سبب انھیں مصورِ غم کا لقب دیا جاتا ہے۔ معاشرے میں عورتوں کی مظلومیت آشکار کرنے اور عورتوں میں

اپنے حقوق کا شعور پیدا کرنے میں راشد الخیری کا نام ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ اپنی تحریروں کے ذریعے انھوں نے عورت کی حالت زار کو بغیر کسی مبالغے کے پیش کیا۔ پریم چند کے ابتدائی ناولوں میں کسان، مزدور، عورت اور طبقاتی نظام کا شکار لوگوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مولوی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور راشد الخیری کے ناول معاشرتی اصلاح کے ساتھ سماج کے تلخ حقائق سے پردہ چاک کرتے ہیں۔

۱۹۳۰ء تک لکھے جانے والے ناولوں میں معاشرے کی ستم ظریفیوں اور سفاکیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان میں سب سے ستم زدہ کردار عورت کا نظر آتا ہے۔ جو ایک طرف گرہستی ظلم و جبر اور محرومی کا نشانہ بنتی ہے تو دوسری طرف طوائف کی صورت میں معاشرتی استحصال کی تصویر پیش کرتی ہے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد ترقی پسند ادب کا آغاز ہوا۔ جاگیر دارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ اس دور میں ناول نگاروں کی توجہ کا مرکز محروم اور پسے ہوئے طبقات رہے۔ عزیز احمد اور عصمت چغتائی کے ہاں نسوانی کرداروں کی جنسی بے راہ روی معاشرتی پابندیوں اور صنفی امتیازات ہی کا ثمر ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد لکھے گئے ناولوں میں مہاجر خواتین کی مظلومیت اور جنسی استحصال کی کرب ناک تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں خدیجہ مستور کا ناول "زمین" بطور خاص دیکھا جاسکتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ناول "تلاشِ بہاراں" میں کنول کماری ٹھاکر اپنی خداداد بہادری اور ذہانت کے باوجود پدرر رانہ آمریت کے خلاف زندگی کی بازی ہار جاتی ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے ناول "آبلہ پا" میں صبا اور اسد کے کردار کے ذریعے پڑھی لکھی خواتین کی مظلومت کو بیان کیا گیا ہے۔ اسد صبا کی نوکری سے مالی فوائد تو حاصل کرنا چاہتا ہے تاہم آزادانہ فیصلوں کا اختیار نہیں دینا چاہتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بیٹے بوبی کے لیے صبا کو ایک آیا سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔ بانو قدسیہ نے "شہر بے مثال" اور "راجہ گدھ" کے ذریعے ستم ظریف معاشرے میں عورت کی بے وقعتی اور مظلومیت کو موضوع بنایا ہے۔ انور سجاد اور دوسرے بہت سے ناول نگاروں نے بھی اپنے ناولوں میں عورت کی سماجی و معاشرتی مظلومیت کے حوالے سے آواز اٹھائی ہے۔

ناول نگار کی کامیابی یہ ہے کہ وہ مبالغہ آرائی کی بجائے زندگی کی حقیقی تصویر پیش کرے۔ صنفی امتیاز ہمارے معاشرے کی وہ حقیقت ہے جس سے کسی طور آنکھیں نہیں چرائی جاسکتیں۔ عورت ہونے کے سبب خالدہ حسین نہ صرف صنفِ نازک سے روا استحصالی رویے سے واقف ہیں بلکہ اپنی کہانیوں میں اس کا حقیقت پسندانہ اظہار بھی کرتی نظر آتی ہیں۔ زندگی کی اونچ نیچ میں عورت کی تقدیر کے فیصلے بلواسطہ یا بلاواسطہ مرد کے ہاتھ میں رہے ہیں۔ مدارجِ حیات میں عورت کی معاشرتی حیثیت تبدیل ہوتی ہے، بچپن سے جوانی تک کا دور بحیثیت بیٹی اور بہن کے، وہ مخصوص دائرے میں والدین اور بھائیوں کے زیر عتاب گزارتی ہے۔ اس کی ذرا سی لغزش ساری زندگی کا روگ بن سکتی ہے۔ شادی کے بعد وہ ایک نئے دائرے میں مقید کر دی جاتی ہے۔ اس دائرے کی وسعت کا اختیار اس کے شوہر کے پاس ہے، وہ چاہے تو اس دائرے کو وسیع کر دے یا اس قدر تنگ کر دے کہ صنفِ نازک کا جینا دوبھر ہو جائے۔ یعنی برائے نام آزادی بھی محکومی کی زنجیر سے بندھی ہے۔ بالفاظ دیگر مرد عورت کی آزادی کا قاتل ہے، وہ اس کرب سے بار بار گزرنے کے باوجود مکتی نہیں پاتی۔ فہمیدہ ریاض اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

> "ہندوستان کے قدیم ترین تمدن اور تہذیب سے لے کر آج تک اس خطے میں یوں تو عورت دیویوں کے روپ میں کثرت سے نظر آتی ہے لیکن اس کی سماجی حیثیت مرد کے زیر نگیں رہی ہے۔ بیٹی کی حیثیت باپ

کی ملکیت ہے جس کو وہ شوہر کو دان کرتا ہے (کنیادان) پھر وہ شوہر کی ملکیت جسے وہ جوئے میں ہار بھی سکتا ہے۔۔۔"(۶)

"کاغذی گھاٹ" میں خالدہ حسین نے معاشرے میں بیٹی، بہن، بیوی اور ماں ہر حیثیت سے عورت کے کردار اور معاشرتی مقام کو واضح کیا ہے۔ مونا کے کردار کی صورت میں ہمیں معاشرے میں بیٹی اور بہن کا کردار نظر آتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد دو طرح کے طبقات نے جنم لیا: ایک طرف بدلتی اقدار کے ساتھ مغربی خیالات کا حامل طبقہ، دوسری طرف مذہبی اقدار کو گلے سے لگائے روایت پرست طبقہ۔ مونا روایتی مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ تاہم اس کے والد اولاد کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ وہ مونا کو شہر کے معیاری اسکول میں بھیجتے ہیں جو ایک ہندو کی ملکیت ہے۔ اسکول کے متعصب ماحول کی وجہ سے بہت جلد اس کا اسکول تبدیل کروادیا جاتا ہے۔ مونا اسکول کی تبدیلی سے ناخوش ہے۔ اس کے والد بھی نئے اسکول کے ماحول اور معیار تعلیم سے غیر مطمئن ہیں۔ تاہم مونا کو اس کے بھائی امتی کی طرح کانونٹ اسکول نہیں بھیجا جاتا۔ اس کے پیچھے لاشعوری طور پر صنفی امتیاز کارفرما ہے۔ جو مونا کے گھر کے روایتی ماحول کا حصہ ہے۔ بچپن میں مونا کے کھیل کود پر کوئی پابندی نہیں تھی، تاہم جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی اس کی دنیا گھر کی چاردیواری سے اسکول تک محدود ہو گئی۔ اس کی اسی محدود زندگی کا مذاق افروزان الفاظ میں اڑاتی ہے:

"ارے کہاں اس بی بی کے لیے تو کہار ڈولی لاتے ہیں۔ یہ پردہ نشین ڈولی میں بیٹھے بیٹھے گھر پہنچ جاتی ہے۔"(۷)

مونا کے کردار سے خالدہ حسین نے شادی سے پہلے عورت کی تصویر پیش کی ہے کہ وہ کن مسائل اور معاشرتی پابندیوں کا شکار ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں مرد اور عورت کو دوہرے معیار پر تولہ جاتا ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے دو رجحانات پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ طبقہ ہے جو مغربی اقدار سے متاثر ہو کر عورتوں کے لیے جدید تعلیم کا قائل ہے۔ وہ جدید تعلیم کے حصول کو وقت کا تقاضا خیال کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ طبقہ ہے جو مغربی اقدار کو مذہبی اور معاشرتی زندگی کے لیے خطرہ خیال کرتے ہیں۔ وہ تعلیم کو عورتوں کے لیے محض تربیت کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ موخر الذکر کے نزدیک اصلاح و تربیت کے لیے محض مذہبی تعلیم ہی کافی ہے۔ یوں عورت کی تعلیم مذہب اور امورِ خانہ داری تک محدود ہو جاتی ہے۔ بدلتے ہوئے معاشرتی تقاضوں کے سبب ہمارے ہاں درج بالا دونوں رجحانات کی نہ تو مکمل طور پر پیروی کی جاتی ہے اور نہ تردید۔ جس کا نتیجہ یوں نکلا ہے کہ ہمارے ہاں مردوں کی طرح عورتوں پر بھی حصولِ تعلیم لازم ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے انھیں اعلیٰ تعلیم دلوائی جاتی ہے۔ تاہم پیشہ ورانہ زندگی میں مرد و زن کے لیے متضاد نظام ہے۔ ایک طرف پڑھی لکھی عورت کو گرہستی زندگی تک محدود کر کے اس کے تشخص کو مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوسری طرف مرد کو زندگی میں آگے بڑھنے اور اپنی انفرادیت منوانے کے سینکڑوں مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ خالدہ حسین نے معاشرے کا یہی تضاد واضح کیا ہے کہ ہم عورت کی جدید تعلیم کے تو قائل ہیں لیکن اس کو زندگی میں آگے بڑھنے اور اپنی پہچان بنانے کی اجازت دینے کو تیار نہیں۔

مونا اپنے تعلیمی سفر کی منازل طے کرتے ہوئے اسکول سے کالج اور یونیورسٹی تک کا سفر طے کر لیتی ہے۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں ہے جس میں والدین کو لڑکیوں کی شادی کی فکر ستانے لگتی ہے۔ بڑی بہن کی شادی کے بعد مونا کو ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس کے سر سے سائبان اٹھ گیا ہو، وہ گھر میں سب سے چھوٹی ہوتے ہوئے بھی خود کو سب سے بڑی محسوس کرتی ہے۔ گھر کے ماحول اور بڑے بھائی کی روک ٹوک اسے بار بار احساس دلاتی ہے کہ وہ بڑی ہو چکی ہے اور اپنے ہر عمل کے لیے جواب دہ ہے۔ تخلیقی شعور ہونے کے باوجود اس کو ادبی محفلوں میں آنے جانے کی اجازت تھی اور نہ اپنی تخلیقات کا سلسلہ جاری رکھنے کی۔ اس کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی جارہی تھی کہ ادبی تخلیق عورت کے لیے وقت گزاری کا مشغلہ تو ہو سکتا ہے، منزل نہیں۔ اس کی اصل منزل یہی ہے کہ وہ شادی کر کے خود کو امور خانہ داری تک محدود کر لے۔ لکھنے پڑھنے کی جزوقتی اجازت تو محض وقت گزاری کے لیے تھی کہ جب تک کوئی مناسب رشتہ نہیں آجاتا۔ یہاں مونا پڑھی لکھی حساس عورت کی نمایندگی بھی کر رہی ہے جو معاشرتی اور اخلاقی ضابطوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس کا فہم و شعور حبس زدہ ماحول کی کرب ناکی میں مزید اضافہ کر دیتا ہے:

> "پھر حسبِ معمول احساسِ جرم کی تاریک دبیز لہروں میں ایک کا اضافہ ہو گیا اور تاریکی کا سیال پہاڑ ہر دم اس کے دل و دماغ کو کچلنے لگا۔ سب کچھ غلط ہے۔ اس کا لکھنا، چھپنا، براڈ کاسٹنگ۔ صرف باجی ٹھیک ہیں اور اماں اور یہ گھر اور وہ ساری کزنز جو پکائی سلائی کی ماہر ہیں۔ اور بچوں کو اتنی مہارت سے سنبھالتی ہیں اور ماؤں کے کام نمٹاتی ہیں۔ پورا گھر چلاتی ہیں۔"(۸)

یعنی معاشرے میں عورت کا قابل قبول اور باعثِ ستائش کردار محض گھر داری ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی کردار معاشرتی روایات سے متصادم ہو گا۔ لہٰذا روایت کے عین مطابق بیٹی کے جوان ہوتے ہی والدین کی ساری توانائیاں مناسب رشتے کی تلاش میں صرف ہونے لگتیں ہیں۔ اس کا اظہار ذیل کے اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

> "دراصل شادی ایک دوڑ تھی۔ میراتھن ریس۔ والدین اس میں سرپٹ بھاگ رہے تھے۔"(۹)

محض دوڑنے سے یہ ریس جیتی جا سکتی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ یہاں تو بار بار گر کے پھر سے دوڑنا پڑتا ہے۔ یوں بار بار گرنے سے حوصلہ پست ہوتے ہوئے مایوسی میں بدلنے لگتا ہے۔ دراصل ہمارے ہاں عورتوں کی تعداد مردوں کی نسبت زیادہ ہے۔ نتیجۃً مرد کی نسبت عورت کے لیے مناسب رشتہ تلاش کرنا زیادہ مشکل ہے۔ جب یہ معاملہ تعلیم یافتہ عورت کے لیے ہو تو اس کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ رشتے کے معاملے میں طلب اور رسد کا درج بالا فرق صنفی امتیاز سے مل کر گھمبیر صورت اختیار کر جاتا ہے۔ مونا کی بڑی بہن عفت کی شادی ایک معقول اور خوشحال خاندان میں ہو چکی تھی۔ اب مونا کی والدہ کو دن رات اس کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ کوشش کے باوجود مونا کے لیے مناسب رشتہ نہ ملنا اس کے گھر والوں کے لیے پریشانی کا سبب بنتا جا رہا تھا۔ اس کی والدہ کو اندر ہی اندر ایک اور خوف کھا رہا تھا کہ وہ اپنی بہن کی طرح سلیقہ شعار نہیں تھی۔ لاڈ پیار نے مونا کو گھر داری سے دور رکھا تھا۔ اس کا سارا دھیان پڑھنے لکھنے میں تھا۔ اس کی خالہ کا یہ کہنا کہ وہ اپنے میاں کو کہانی گوشت بنا کر کھلائے گی دراصل اس کی تخلیقی زندگی پر طنز ہے۔ اس کی ہم عمر لڑکیوں کی شادیاں ہوتی جا رہی تھیں کچھ رشتے آئے بھی لیکن لڑکے والوں کے ناز نخرے کی وجہ سے بات نہیں بنی۔ شادی جسے والدین اپنا مقدس فریضہ سمجھ کے نبھاتے ہیں اس کے نام پر ہمارے معاشرے میں کس طرح والدین کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور عورت کو پناہ گاہ مہیا کرنے کے بدلے اس کی بولی لگائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"اسے معلوم تھا ایک نہایت اذیت ناک مرحلہ اس کی زندگی میں آنے کو ہے۔ جب خاندانی برسر روزگار لڑکوں کی مائیں اسے بھیڑ بکری کی طرح جانچیں اور ٹٹولیں گی۔ اور ناک منہ چڑھا کے چلی جائیں گی۔۔۔ یہ صدیوں کا جابرانہ سوشل نظام جو ہمارے رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے۔ چاہیں بھی تو ہم اس سے بھاگ کر نہیں جا سکتے۔"(۱۰)

شادی کے بعد عورت کو ڈولی میں بٹھا کر میکے سے ہمیشہ کے لیے وداع کر دیا جاتا ہے۔ اب اس کا مستقر سسرال ہے۔ عورت کے والدین فرض سے سبکدوشی پر ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہیں۔ دوسری طرف عورت کا اصل امتحان تو سسرال میں آکر شروع ہوتا ہے۔ وہ سسرال کے مطابق خود کو ڈھال لیتی ہے تو اس کی زندگی نسبتاً آسان ہو جاتی ہے، اگر وہ سسرال میں جگہ نہیں بنا پاتی تو اس کی باقی ماندہ زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ بہر حال درج بالا دونوں صورتوں میں عورت استحصال کا نشانہ بنتی ہے، وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتی ہے تو اپنی انفرادیت کھو دیتی ہے۔ دوسری طرف اگر وہ اپنی انفرادیت قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے تو اس پر زندگی تنگ کر دی جاتی ہے۔ معاشرے میں کامیاب اور قابل تحسین عورت اسے ہی سمجھا جاتا ہے جو خود کو حالات کے مطابق ڈھال کر اپنی پہچان مٹا دیتی ہے۔

عائشہ کے کردار کی صورت میں خالدہ حسین نے مغربی اقدار سے متاثر گھرانوں میں عورت کا مقام و مرتبہ پیش کیا ہے۔ عائشہ، بے حد خوبصورت اور بااعتماد لڑکی ہے۔ وہ روشن خیال اور ادبی شغف رکھنے والے خوشحال خاندان سے تعلق رکھتی ہے، جو تقسیم کے بعد لدھیانے سے آکر لاہور میں آباد ہو گیا تھا۔ ان کے گھر ادبی کتب کا وسیع ذخیرہ تھا۔ اس کے بھائی جمیل اختر الایمان کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ گھر کے روشن خیال ماحول کے سبب کالج لیول تک آتے آتے عائشہ انتہائی پر اعتماد اور بولڈ لڑکی بن چکی تھی۔ انگریزی ادب اور ہالی وڈ فلموں کے شوق سے نہ صرف اس کے لب و لہجے میں انگریزی الفاظ و محاورات کثرت سے استعمال ہونے لگے تھے بلکہ اس کے روزمرہ معاملات میں بھی مغربی زندگی کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ وہ ہائی سوسائٹی کی مکمل طور پر نمایندگی کر رہی تھی۔ اس کے اندر معاشرتی برتری کا احساس شدت سے موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مونا پہلی ہی ملاقات میں عائشہ کی خوبصورتی اور پر اعتماد رویے سے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہے اور یہ تاثر عائشہ کی شادی تک قائم رہتا ہے۔

عائشہ کی کہانی میں المیہ صورتحال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کی شادی ایک نو دولتیے سول سرونٹ سے ہو جاتی ہے۔ نئی نویلی دلہن اپنے ساتھ بہت سے تہذیبی اثاثے، خواب اور آرزوئیں لے کر سسرال جاتی ہے تاہم اس خود اعتماد اور بولڈ لڑکی کی زندگی بھی شادی کے بعد عام لڑکیوں سے مختلف نہیں تھی۔ خود پسند لڑکی جو حالات کے مطابق چلنے کی بجائے حالات کو اپنے مطابق ڈھالنے کی قائل تھی۔ شادی کے بعد اس کا احساسِ برتری آہستہ آہستہ بے بسی اور احساسِ محرومی میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ عائشہ اپنے آپ کو مکمل طور پر شوہر کی منشا کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ خالدہ حسین کے نزدیک عورت کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ وہ صنفی جنگ میں اپنے بکھرتے خوابوں اور شخصیت کو سمیٹنے کے بجائے خود کو پوری طرح مرد کے تابع کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کوشش میں اپنی پہچان کھو دیتی ہے۔ ناول کے آخر میں مونا کی عائشہ سے ملاقات، عائشہ کی سوچ کے ساتھ اس کے حلیے کا بدلاؤ اسی معاشرتی حقیقت کا ادراک ہے۔ اس کی ترجمانی اس اقتباس میں دیکھی جاسکتی ہے:

"ہاں وہ اصل وجود ہی تورکاوٹ تھا۔وہ نفرت ،غیرت اور تعصب کی دیوار کھڑی کرر کھی تھی۔۔۔فتح اور کامرانی کے بہت سے انداز ہوتے ہیں مگر شکست کا ایک ہی راستہ ہے۔مکمل پسپائی۔سپردگی فنا۔۔۔"(۱۱)

"کاغذی گھاٹ" میں کم و بیش تمام نسوانی کردار کسی نہ کسی حوالے سے معاشرتی استحصال کا شکار ہیں۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو عورت اپنی اس مظلومیت کی خود بھی ذمہ دار ہے۔وہ خود کو منوانا چاہے تو کامیاب بھی ہو سکتی ہے۔اس ضمن میں افروز کی مثال ہمارے سامنے ہے۔فطری اعتبار سے افروز اور عائشہ متضاد شخصیات ہیں۔عائشہ مخصوص تہذیب اور کلچر کی دعوے دار ہے تو افروز خود کو تہذیب و کلچر کی پابندیوں سے آزاد سمجھتی ہے۔وہ تعصب، مذہبی اور فکری بندشوں سے آزاد بے باک لڑکی ہے۔ حق بات کے لیے ڈٹ جانے والی چٹان جیسی شخصیت کی مالک افروزاپنی زندگی کے فیصلے خود کرناچاہتی ہے۔عالمی ادب اور سیاست پر اس کی گہری نظر ہے۔اس کے خیال میں معاشرے سے تعصب اور استحصال کے خاتمے کے لیے مارکسیت ناگزیر ہے۔وہ آمریت سے پاک جمہوری معاشرے کی خواہاں ہے۔اس مقصد کے لیے وہ جلسے جلوسوں میں بھی شرکت کرتی ہے۔وہیں اس کی ملاقات جمال سے ہوتی ہے۔جمال چھ جماعتیں پڑھ کر ٹیکسٹائل مل میں مزدوری کرنے لگا تھا،وہ مل مزدوروں کا لیڈر تھا۔ معاشرتی قوانین، اخلاقی ضابطوں اور گھٹن زدہ ماحول سے بیزار لڑکی گھر والوں کی مرضی کے خلاف جمال سے شادی کر لیتی ہے۔شادی کے بعد مونا سے ملاقات میں افروز کی اداسی اور بے رنگی فاتحانہ جشن کے بجائے ماتم کو ظاہر کر رہی ہے۔ دیکھیے یہ اقتباس:

"اس کا چہرہ کتنا زرد نظر آرہا تھا۔ایک بانہہ میں کانچ کی چوڑیاں اور کچھ بھی نہیں۔یہ کیسی شادی ہے۔کوئی ابٹن۔ مہندی میں بسے ہاتھ۔افشاں سے چمکتی مانگ،نہ جگمگاتا عروسی جوڑا۔پھولوں کی نرم گرم خوشبو نہ صحن میں گونجتے سہاگ گیت۔ہاتھ میں چھلا تک نہیں۔"(۱۲)

افروز فعال سوشلسٹ لڑکی ناکامی اور شکست سے ناآشنا ہے۔بہادری اور ثابت قدمی سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب تو ہو جاتی ہے۔ تاہم اس کامیابی کے بدلے اپنی انفرادیت کھو دیتی ہے۔یہاں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اعلی تعلیم یافتہ بے باک لڑکی کیوں کر ان پڑھ مزدور کو اپنا آئیڈیل مان لیتی ہے۔اس بارے میں اقتباس ملاحظہ ہو:

"افروز کے ساتھ گزرا وقت ایک ثانیہ میں اس کی نظروں میں گھوم گیا۔وہ ساحر اور اختر الایمان کی نظمیں ۔۔۔کیا یہ شخص افروز کو پہچانتا بھی ہے۔وہ سارا عالمی ادب گھول کے پی جانے والی سربلند لڑکی۔سچ کے لیے ہر طاقت سے ٹکرا جانے والی سربلند۔ کیا عورت صرف اپنے آپ کو پاش پاش کرنے کے لیے تعمیر پاتی ہے؟"(۱۳)

افروز مونا کو صلاحیتوں کے ضیاع اور بزدلی کے طعنے دیتی تھی۔صدیوں سے بیمار سوشل نظام سے تصادم میں افروز اپنی انفرادیت ہار چکی تھی۔یوں افروز کے کردار کے ذریعے خالدہ حسین نے حالات سے مجبور عورت کی بے بسی کو اجاگر کیا ہے۔مصنفہ نے کہانی کے مرکزی کرداروں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ پدرسری معاشرے میں شادی والدین کی رضامندی سے ہو یا پسند کی انجام ایک جیسا ہوتا ہے۔عائشہ کی شادی والدین کی رضامندی سے روایتی انداز میں دھوم دھام سے ہوئی،دوسری طرف افروز والدین کی مرضی کے خلاف پسند کی شادی کرتی ہے۔ تاہم دونوں کے انجام میں کوئی واضح فرق نہیں۔عائشہ کی شادی کے بعد اس کی مظلومت پر آنسو بہانے والی افروز خود ایک بے جوڑ رشتے میں بندھ کر

بے بسی کی تصویر بن چکی تھی۔ افروز کے اس المناک انجام پر مونا کچھ اس طرح گریہ کناں ہے:

"دروازے کی چٹخنی چڑھا کر وہ بستر میں گر گئی۔ اس کی آنکھیں پتھر کی طرح خشک تھیں۔ حلق میں کانٹے پڑے تھے۔ اسے یاد آیا افروز نے کتنی ہی بار آنسو پیتے ہوئے کہا تھا، میری سمجھ میں نہیں آتا عائشہ ایسی نفیس لڑکی حسیب کا لب و لہجہ، اس کی پوری شخصیت کس طرح برداشت کرتی ہے۔ اور اب وہ خود۔۔ کوئی اس کی کنپٹیوں پر ہتھوڑے مار رہا تھا۔ افروز جو فزکس میں ریسرچ کر رہی تھی۔ گورکی، شولوخوف اور زولا کی مداح اور جمال۔۔۔ جمال تو ان سب سے بہت دور تھا۔"(۱۴)

معاشرے میں عورت دوہرے استحصال کا شکار ہے۔ ایک طرف وہ سماجی ضابطوں کی پابند ہے تو دوسری طرف مرد کی حاکمیت کا شکار۔ رسم و رواج اور معاشرتی پابندیاں عورت میں گھٹن اور بے بسی کا سبب بنتی ہیں۔ انسان خواہ کتنا ہی بہادر اور بے باک ہو نامساعد حالات اس کو ذہنی کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں اور اس کی خودداری کو ٹھیس پہنچاتے ہیں۔ بعض اوقات اس مایوس کن صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے لیا گیا فیصلہ، اس کے لیے پوری زندگی کا پچھتاوا ثابت ہوتا ہے۔ فطری کمزوری اور معاشرتی دباؤ عورت کو داخلی طور پر کمزور کر دیتا ہے۔ یوں وہ اپنے داخل میں جاری عزت نفس کی جنگ لاشعوری طور پر ہار جاتی ہے۔ اس شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ جب وہ استحصالی نظام کے خلاف سینہ سپر ہونے کی کوشش کرتی ہے تو اس کے اپنے فیصلے ہی اس کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا دیتے ہیں۔ افروز کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ گھر کے اخلاقی ضابطوں سے آزادی کی قیمت وہ روشن مستقبل کی قربانی کی صورت میں دیتی ہے۔ معاشرے کی بہتری کی خواہش مند انقلابی سوچ کی حامل افروز اپنی زندگی کو ایک مزدور کے رحم و کرم پر چھوڑ کر پھر سے استحصالی نظام کی حاکمیت کو قبول کر چکی ہے، جس میں نقصان صرف عورت کا ہی ہوتا ہے۔ شادی کے بعد افروز، مونا سے گفتگو میں معاشرتی نظام کے سامنے عورت کی بے بسی کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتی ہے:

"۔۔۔ ایک کال کوٹھری میں مسلسل موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی خود اپنی موت کا انتخاب کرے۔"(۱۵)

"کاغذی گھاٹ" میں تین سہیلیاں، تین مختلف طبقات میں عورت کے مقام و مرتبے اور شادی کے بعد انجام کار کی آئینہ دار ہیں۔ مونا روایت پسند متوسط طبقے میں پڑھی لکھی حساس عورت کی نمائندہ ہے۔ معاشرتی جکڑ بندیاں اس کی راہ میں حائل ہیں۔ وہ اپنے کتھارسس کے لیے قلم کا استعمال کرتی ہے۔ مونا کے برعکس عائشہ روشن خیال ادبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے گھر کا ماحول ہر طرح کے صنفی امتیاز سے پاک ہے۔ گھر کا صحت مند ماحول اس کی خود اعتمادی اور شخصی نکھار کا سبب بنتا ہے۔ وہ معاشرے میں ہائی کلاس کی عکاسی کر رہی ہے۔ تیسرا کردار افروز کا ہے جو ناول کے تمام نسوانی کرداروں میں اپنی اجتہادی سوچ کی وجہ سے نمایاں ہے۔ متوسط کلاس مہاجر خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکی کا باپ کانگرس کا سرگرم لیڈر تھا۔ باپ کی طرح بیٹی بھی انقلابی سوچ کی مالک ہے اور عملی طور پر معاشرتی جبر کے خلاف برسرپیکار ہے۔ خالدہ حسین نے جہاں مختلف خاندانی پس منظر سے متعلق گھرانوں میں عورت کا مقام و مرتبہ واضح کیا ہے، وہیں شادی کے بعد ان کا المناک انجام بھی دکھایا ہے۔ عائشہ اور افروز کی شادی کے بعد کی زندگی اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ عورت اگر میکے میں آزادانہ اور باوقار حیثیت کی حامل ہے، ضروری نہیں اسے سسرال میں بھی وہی آزادی اور بے فکری ملے۔ اس کی

بنیادی وجہ ہمارا روایتی نظام ہے جس میں شوہر کو بیوی کا مجازی خدا تصور کیا جاتا ہے۔ عائشہ اور افروز بھی اپنی تمام تر روشن خیالی اور بے باکی کے باوجود اس نظام کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ ان دونوں کے انجام سے خوف زدہ مونا اپنے مستقبل کے بارے میں غیر یقینی کیفیت کا شکار ہے۔ اسی لیے خالدہ حسین نے شادی کو عورت کے لیے تمت بالخیر قرار دیا ہے، کہتی ہیں:

"مگر اس کے بعد کیا ہوا؟ عائشہ بھی۔ وہ سب ایک پرچھائیں میں ڈھل گئی۔ اور اب افروز۔ سب اپنے اپنے انداز میں تمت بالخیر کی طرف رواں ہیں۔"(۱۶)

کہانی میں آنے والے دیگر نسوانی کردار مثلاً نور آپا، مونا کی اماں اور دیگر بھی کسی نہ کسی حوالے سے معاشرتی محرومیوں کا شکار ہیں۔ یہ محرومیاں عموی طور پر شادی کے بعد بدترین صورت اختیار کر جاتی ہیں۔ جیسا کہ نور آپا کا کردار جو مونا کی بڑی اماں کی رشتے دار تھی۔ خوبصورت اور پھرتیلی لڑکی اپنے انجام سے بے خبر اپنی دنیا میں مگن تھی۔ وہ پہلے سے شادی شدہ مختار کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ اس باغیانہ روش کی وجہ سے خاندان میں نور آپا کا نام حرفِ ممنوع بن چکا تھا۔ ناول کے آخر میں نور آپا معاشرتی جبر کی داستان لیے اچانک مونا کو نظر آجاتی ہے:

"آپا نور وہ حیران رہ گئی۔ بس ایک ہلکی سی مشابہت۔ سانولا مرجھایا ہوا چہرہ۔ کچھڑی بال شٹل کاک برقعے کی اطراف جھانک رہے تھے۔ چھدرے دانت اور بے تحاشہ پھولا ہوا پیٹ۔"(۱۷)

ان محرومیوں کی بنیادی وجہ اس کا عورت ہونا ہے۔ والدین کے گھر ناز نخرے اٹھوانے والی بیٹیاں جب پیا گھر سدھارتی ہیں تو شادی کا یہ رشتہ ان کے نام وجود، خواہشات، خواب اور بعض اوقات پہچان تک کو پدرسری نظام کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت ہمیشہ اپنے ماضی کو یاد کرتی ہے اور میکے کا دور اس کے لیے یادگار ہوتا ہے:

"شاید عورت ہمیشہ ہی اپنے میکے میں بستی ہے۔ وہ بابل کی حویلی کی دہلیز کبھی پار نہیں کرتی۔"(۱۸)

اسی لیے خالدہ حسین نے شادی کو عورت کے لیے تمت بالخیر قرار دیا ہے۔ اس تمت بالخیر کے لیے عورت کو بچپن ہی سے تربیت دی جاتی ہے کہ اسے ہر صورت اس رشتے کو قائم رکھنا ہے اور اس کی پہچان اس کے مرد سے ہے۔ مرد ہی اس کی زندگی کا ضامن ہے:

"شاید سب سے بڑی حقیقت ہر صورت زندگی کا تسلسل ہے۔ اس کا ہر قیمت پر چلتے رہنا ہے۔ یہ قدرت کا منصوبہ ہے۔ سانس لینا۔ سانس کی اپنی لذت ہے۔ ہونے کی سرشاری۔ اور ہر کوئی اس کا اسیر۔ کیا اپنی بہترین صورت میں وجود کو منجمد کر لینے۔ اسی ایک لمحے میں رک جانے اور محفوظ ہو جانے کا کوئی طریقہ نہیں؟"(۱۹)

خالدہ حسین کے ہاں مرد اور عورت کے حوالے سے جو بنیادی تصور ملتا ہے وہ یہ ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت کو کم تر سمجھا جاتا ہے اور اس کو شعوری سطح پر اور کہیں لاشعوری طور پر فراموش کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمارے معاشرتی ماحول کو کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ عورت مرد کی دست نگر رہے۔ کوئی مرد اگر شعوری طور پر مرد و زن کی برابری کا پرچار کرتا بھی ہے تو لاشعوری طور پر وہ عورت کو کم تر ہی خیال کرتا ہے۔ اس لاشعور کے پیچھے دراصل مرد کی آمرانہ سوچ کارفرما ہے، جو عورت کو اپنے برابر مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر عورت آگے نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کو دبا دیا جاتا ہے۔ مونا کا خیال تھا کہ حسن، جس سے وہ ذہنی اور جذباتی طور پر متاثر تھی

شاید دوسرے مردوں سے مختلف سوچ رکھتا ہے تاہم ایک حساس اور منطقی سوچ رکھنے کے باوجود بعض معاملات میں وہ روایتی سوچ کا حامل ہے:

> "وہ حسن کی تلخی سے لرز جاتی یکدم وہ اسی ایک عام سطحی انسان نظر آنے لگتا۔سب لوگوں کی طرح۔ باوجود یکہ وہ روحانی کیفیات اور باطنی واردت کا شناسا تھا مگر بنیادی طور پر وہ بھی ایک عام کمینگی کے قریب قریب پہنچ جانے والا شخص تھا۔وہ جس میں سنگدلی بھی تھی اور دوسروں کی تحقیر کرنے کی ترغیب بھی۔"(۲۰)

عورت معاشرتی نظام سے بغاوت کر کے خود مختار ہونے کی کوشش کرتی ہے تو اس کو ہر قدم پر نئی نئی سختیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جن کا مقابلہ موجودہ معاشرتی نظام میں رہ کر ممکن نہیں۔اگر وہ اس نظام سے ٹکر لیتی بھی ہے تو اس تصادم میں اس کا اپنا وجود پاش پاش ہو جاتا ہے۔لہذا صنف نازک اپنی عافیت اسی میں جانتی ہے کہ وہ خود کو پدر سری نظام کے حوالے کر دے، جہاں اس کی تقدیر کے تمام فیصلے مرد کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔اپنے جذبات، احساسات، پسند ناپسند کو مرد کے تابع کر لینے میں ہی اس کی فلاح ہے۔اس سلسلے میں عائشہ کی مثال دیکھی جا سکتی ہے:

> "مونا مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھی۔وہ عائشہ کہاں تھی؟کیا صورتیں اس طرح بھی بدلا کرتی ہیں۔وہ سنہری لمبی چوٹی کہاں ہے۔وہاں میک اپ سے لدی پختہ چہرے کے گرد کالے سیاہ، سیدھے بال، شانوں تک کٹے تھے۔ اور وہ سنہری شعاعیں بکھیرتی آنکھیں۔اس نے حیرت سے دیکھا۔سبز؟
>
> یہ تمہاری آنکھوں کا رنگ۔۔۔یہ سبز آنکھیں۔
>
> ہاں یہ سجاوٹی کنڈیکٹ لینز ہیں۔حسیب کی پسندیدہ ہری آنکھیں۔
>
> یہ سیاہ بال حسیب کے پسندیدہ بال۔اسے سنہری بالوں سے شدید چڑ ہے۔اور سنہری آنکھیں تو بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔
>
> مگر وہ بال۔۔وہ آنکھیں۔۔وہ تو تمھارا اصل وجود تھا۔"(۲۱)

یہاں خالدہ حسین یہ سوال اٹھاتی ہیں، ہمارے معاشرے میں آخر مرد اور عورت کی اس قدر تخصیص کیوں کی گئی ہے؟کیا انسان کی تعریف میں صرف مرد آتا ہے؟عورت کے کوئی جذبات، احساسات نہیں جن کے مطابق وہ اپنی زندگی گزار سکے؟اگر ہیں، تو پھر مرد کا عورت کے ساتھ یہ سلوک کیوں ہے؟اس تلخ حقیقت کا جواب افروز کے ان الفاظ سے مل جاتا ہے:

> "کیونکہ وہ بیوی کے ساتھ رفاقت کا نہیں افسر اور حاکم کا رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں۔ان سے صبح شام اپنی شان میں قصیدے سننا چاہتے ہیں۔اور تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایک طبقہ بیوی کو پاوں کی جوتی قرار دیتا ہے کہ پسند نہ آئی یا اس نے تنگ کیا تو دوسری پہن لی۔یہی وہ تہذیبی روایات ہیں جن کی ہم پاسداری کرتے ہیں اور جن کی پاسداری کرتے کرتے ہماری نوے فیصد عورتیں وقت سے پہلے مر جاتی ہیں۔"(۲۲)

فطرت نے عورت کو کمزور پیدا کیا ہے۔بنیادی طور پر وہ ترحم کی مستحق ہے نہ کہ ظلم اور صنفی امتیاز کی۔ معاشرہ عورت کو تحفظ دینے میں تو ناکام نظر آتا ہی ہے لیکن ظلم یہ ہے کہ وہ اپنے متعین کردہ مقام و مرتبے سے بھی محروم ہے۔

جو اس کے تشخص اور بقا کے لیے زہر قاتل ہے۔ مرد عورت کو ایذا پہنچانا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ اس ایذارسانی سے وہ اپنی مردانہ انانیت کی تسکین کرتا ہے۔ یعنی ایک عورت کو زیر کرنے کے لیے وہ خود کو درجہ انسانیت سے نیچے گرا لیتا ہے۔ صوفیا کے نزدیک انسان کا باطن ایک گھنے تاریک جنگل کی مانند ہے۔ جس میں خونخوار درندے اور مکار جانوروں کا بسیرا ہے۔ آدمیت دراصل ان فتنہ پرور عناصر کو زیر کر لینے کا نام ہے۔ تاہم زیادہ تر انسان باطن کے شر و رفتن کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ حسیب بھی انھی لوگوں کا نمائندہ ہے، بظاہر بہت شائستہ اور مہذب انسان ہے۔ لیکن شادی کے بعد اس کی حقیقت ایک اکھڑ اور بد مزاج انسان کے طور پر سامنے آتی ہے۔

"کاغذی گھاٹ" میں خالدہ حسین نے مرد کی اسی سوچ اور معاشرتی تفریق کے بارے میں سوالات کھڑے کیے ہیں۔ یہاں یہ نقطہ بھی قابلِ غور ہے کہ ان کے ہاں نسوانی کردار مردانہ کرداروں کے سامنے اپنی فطری کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی شکست پر نوحہ کناں نظر آتے ہیں۔ دراصل خالدہ حسین اس حقیقت کو باور کروانا چاہتی ہیں کہ پدرسری نظام میں عورت روایات کے سامنے سر جھکا دے یا ان سے بغاوت کر کے خود کو آزاد خیال ظاہر کرے۔ دونوں صورتوں میں اس کا انجام ایک جیسا ہوتا ہے:

> "اماں کو ان کی ماں کو۔ آج تک ہر عورت کو صرف ایک ہی گیت یاد تھا۔ کنکاں لمیاں دھیاں کیوں جمیاں نی مائے۔ اور شاید اسے بھی اور اس کی بیٹیوں اور ان کی بیٹیوں اور ہمیشہ آنے والیوں کو بھی بس ایک ہی گیت یاد رہے گا۔ لفظ بدل جائیں گے۔ مگر مفہوم اور احساس نہیں بدلے گا۔" (۲۳)

معاشرتی اونچ نیچ کے نظام سے مفر ممکن نہیں۔ کوئی ادیب اپنے معاشرتی حالات سے کنارہ کش نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب اپنی تحریر میں اپنے ارد گرد کے مسائل پر ہی بحث کرتا ہے۔ عورت سے متعلق مخصوص سوچ کے پیچھے خود خالدہ حسین کی زندگی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے پہلے تو وہ خود عورت تھیں اور مشرقی معاشرے میں عورت کے مقام و مرتبے اور مسائل سے بخوبی آگاہ تھیں۔ خالدہ حسین گھر کے روایتی ماحول، سسرال کی سختیوں، شوہر کی بے پناہ سرکاری ذمہ داریوں، باربار تبادلوں، سسر کی سخت مزاجی اور انفرادی توجہ کی کمی، جوان سال بیٹے کی موت اور بیٹیوں کی پرورش کے سبب معاشرے میں عورت کی مشکلات اور مقام کے حوالے سے مخصوص سوچ کی حامل تھیں۔ مصنفہ نے ذاتی تجربات کی روشنی میں زندگی کے معمولی واقعات کو بھی اس مہارت سے بیان کیا ہے کہ وہ غیر معمولی نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ یوں "کاغذی گھاٹ" کی کہانی ہمارے جیتے جاگتے معاشرے کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

عورت کو فطرت نے جذبات پر قابو اور ضبط کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ وہ اپنی خواہشات اور محرومیوں کے بوجھ تلے مرد کی حاکمیت اور سخت گیری کو برداشت کرتی ہے لیکن اندر ہی اندر شکست وریخت کا شکار رہتی ہے۔ خالدہ حسین نے عورت کے داخلی خوف، اضطراب، بے چینی اور اکیلے پن کو اس کی داخلی شکست و ریخت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ دراصل ہمارے معاشرتی نظام میں عورت پر مرد کی برتری مسلمہ ہے اور یہ ہماری معاشرتی اقدار کا سبب ہے۔ بظاہر مرد عورت کو قتل نہیں کرتا لیکن اس کی آزادی سلب کر کے اس کو ادھموا کر دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) خواجہ حسن نظامی، سی پارۂ دل، (دہلی: درویش پریس، ۱۳۳۴ھ)، ۱۱۲۔

(۲) ممتاز احمد خان، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، (فکشن ہاوس: لاہور، ۲۰۱۷ء)، ۴۷۔

(3) Intezar Hussain" Khalida Hussain turn to the novel", *Dawn*.July06, 2003, p,6

(4) Kamla Basin, Nighat Said Khan. *Feminism and its relevance in South Asia*. New Dehli: Women unlimited,2004, p:3

(۵) فہمیدہ ریاض۔ "فیمینزم اور ہم" مشمولہ، فیمینزم اور ہم۔ ادارت فاطمہ حسن، (کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء)، ۳۲۔

(۶) ایضاً، ۳۴۔

(۷) خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ۱۲۔

(۸) ایضاً، ۱۱۰۔ (۹) ایضاً، ۹۵۔

(۱۰) ایضاً، ۸۸، ۸۷۔ (۱۱) ایضاً، ۱۶۱۔

(۱۲) ایضاً، ۱۵۵۔ (۱۳) ایضاً، ۱۵۲۔

(۱۴) ایضاً، ۱۵۳۔ (۱۵) ایضاً، ۱۵۶۔

(۱۶) ایضاً، ۱۵۵۔ (۱۷) ایضاً، ۱۶۸۔

(۱۸) ایضاً، ۱۱۲۔ (۱۹) ایضاً، ۱۶۹۔

(۲۰) ایضاً، ۱۰۹۔ (۲۱) ایضاً، ۱۶۱۔

(۲۲) ایضاً، ۱۲۶۔ (۲۳) ایضاً، ۱۱۴۔

❖❖❖